(غلام گردش)

سگار، صاحب اور بندر

چند ماہ پہلے پیغام ملا کہ "صاحب" نے بلایا ہے۔ بلا واقدرے عجیب اسلیے تھا کہ اس سے پہلے صرف ایک ملاقات ہوئی تھی۔ ملاقات اگر ناخشگوار نہیں تھی تو خشگوار تو قطعاً نہیں تھی۔ ایک خشک سی، کھردری طرح کی نشست۔ خیر اگلے دن صاحب کے فارم ہاؤس پہنچا تو بتایا گیا کہ سٹڈی میں بیٹھے ہیں۔ سٹڈی پہنچا تو جگہ کسی طرح بھی چھوٹا سا کمرہ نہیں تھی۔ وسیع ہال جس میں دو اطراف نفیس چمڑے میں جلد ہوئی خوبصورت کتابیں ترتیب سے لگی ہوئی تھیں۔ سرسری طور پر دیکھنے پر معلوم ہوا کہ تمام کتب سیاست اور معیشت پر ہیں۔

صاحب، بڑے آرام سے ایک پُرتعیش "راکنگ چیئر" پر بیٹھے ہوئے تھے۔ چیئر پر سونے کی تاروں سے منقش خوبصورت ڈیزائن بنے ہوئے تھے۔ کرسی کے دو ہتھوں کے آخر میں اژدہے کے منہ تراشے ہوئے تھے۔ لگتا تھا کہ دونوں سانپ مجھے غور سے دیکھ رہے ہیں۔ انکی باہر نکلی ہوئی زبانیں کسی کو بھی اپنی لپیٹ میں لے سکتی تھیں۔ گمان ہوتا تھا کہ ابھی کرسی سے باہر نکلیں گے اور ہر ایک کو نگل لینگے۔ شکر ہے کہ وہ صرف اور صرف لکڑی کے بنے ہوئے تھے۔ صاحب بڑی تسلی سے شیشے سے باہر کی طرف دیکھ رہے تھے۔ جہاں انکا بہت بڑا ذاتی چڑیا گھر تھا۔ کہنے لگے کیا حال ہے۔ میری کتابوں کو اتنے غور سے کیوں دیکھ رہے تھے۔ سادہ سا جواب دیا کہ مجھے کتابوں سے عشق ہے۔ صاحب نے زیرلب مسکرا کر طنزیہ طریقے سے کہا، کہ اسی وجہ سے بیوروکریسی میں اتنا پیچھے رہ چکے ہیں۔ کتابیں پڑھنے کیلئے نہیں ہوتیں۔ یہ صرف سجاوٹ کیلئے استعمال ہوتی ہیں۔ ان میں صرف ایک کتاب ہے جسے میں روز پڑھتا ہوں، صرف ایک۔ کئی برس سے سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں پر ابھی تک صرف پچاس فیصد تک سمجھ پایا ہوں۔ کتاب "پرنس" The Prince ہے۔ جو دنیا کے سب سے ظالم فلسفی میکاولی نے سینکڑوں برس پہلے لکھی تھی۔ آج بھی یہ کتاب مکمل طور پر حرف بحرف سچ ہے۔ میرا سادہ سا سوال تھا کہ یہ تو ایک منفی سی کتاب ہے۔ اس میں تو درج ہے کہ بادشاہ کو اپنی حکومت بچانے کیلئے ہر حربہ آزمانا چاہیے۔ جن ساتھیوں کی مدد سے طاقت میں آیا ہے۔ سب سے پہلے انہیں ٹھکانے لگانا چاہیے۔ کسی پر بھی اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔ سلطنت بچانے کیلئے کسی بھی اخلاقی قدروں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔ صاحب میری معصومانہ گفتگو سنکر اُٹھے۔ میز سے کیوبن سگار اُٹھایا اور سلگا کر طمانیت سے پینے لگے۔ تحقیر آمیز انداز میں کہنے لگے۔ برخوردار، اصل سچ اور حقیقت تو یہی ہے۔ بادشاہ کا کوئی دوست نہیں ہونا چاہیے۔ اور اسکا کوئی دشمن زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ تمہیں تیس سال کی نوکری کے بعد بھی رموز سلطنت کی "الف بے" بھی معلوم نہیں۔ طاقت دنیا کا سب سے جان لیوا نشہ ہے۔ اسکے لیے اگر بھائی یا بیٹا بھی قربان کرنا پڑے تو یہ بالکل معمولی سی بات ہے۔

صاحب کی باتوں میں سگار پینے کے ساتھ ساتھ مزید ٹھہراؤ آ رہا تھا۔ اتنی دیر میں بارودی ویٹر گرم کافی کے دو کپ لایا۔ کافی پیتے ہوئے صاحب نے سوال کیا۔ ملک کی سیاست کیسی چل رہی ہے۔ سوچ سمجھ کر جواب دیا، کہ میں ایک سرکاری ملازم ہوں۔ میرا سیاست سے کوئی لینا دینا نہیں۔ میں تو متعدد حکومتوں کے ساتھ کام کرتا رہا ہوں۔ زچ ہو کر صاحب کہنے لگے۔ کہ تمہاری دوسری بڑی غلطی ہے کہ تم کسی بھی سیاسی جماعت یا گروہ کے ساتھ نہیں ہو۔ اسلیے آج تک اپنا ذاتی مکان نہیں بنا پائے۔ ادنیٰ سے سرکاری مکان میں رہنے

پر اکتفا کیے بیٹھے ہو۔تمہیں طاقتور سیاسی گروہوں میں اپنی جگہ بنانے کا فن نہیں آتا۔پھر ایک سینئر سرکاری ملازم کا نام لیا۔مثال دیکر کہا، کہ یہ اتنا ذہین اور دنیادار بچہ ہے کہ ہر حکومت کی آنکھ کا تارا بن جاتا ہے۔تم اس طرح کبھی نہ بن پائے۔اسلیے اتنا پیچھے رہ چکے ہو۔میں نے تلخی سے کہا کہ کسی بھی سرکاری ملازم کا سیاست سے تعلق قوانین کے خلاف ہے۔صاحب نے زور سے قہقہہ لگایا۔قانون،کونسا قانون۔اگر قانون کی عزت یا حرمت ہوتی،تو کیا تمہارا ملک اس درجہ بدحال ہوتا۔قانون بھی ایک سیال مادہ ہے۔جس برتن میں ڈالو اسکی ساخت کا ہو جاتا ہے۔اصل طاقت قانون کی نہیں،لاقانونیت کی ہے۔لیکن یہ بات تمہیں ابھی سمجھ نہیں آئیگی۔میں خاموش سا ہو گیا۔اصل طاقت لاقانونیت میں ہے۔ایسے لگا،شیشے کے باہر بڑے بڑے درخت اپنے پتوں سمیت خاموش سے راگ الاپ رہے ہیں۔اصل جوہر اور طاقت صرف اور صرف لاقانونیت کی ہے۔گھبرا کر صاحب سے کہا، کہ موجودہ حکومت کافی مشکلات کا شکار ہے۔آئندہ چند ہفتوں میں اونٹ کسی نہ کسی طرف بیٹھ جائیگا۔صاحب نے شدید المیہ مسکراہٹ سے کافی پیتے ہوئے کہا مشکلات،کون سی مشکلات۔یہ تمام ہنر تو میرے جیسے لوگوں کی جیب میں ہے۔جو جب چاہیں، جہاں چاہیں کسی بھی طرح کی مشکلات پیدا کر دیں۔یہ تو سانپ اور سیڑھی کا پرانا سا کھیل ہے۔مجھے پتہ ہے کہ کس وقت سانپ کو سیڑھی بنانا ہے اور کس وقت سیڑھی کو سانپ میں تبدیل کرنا ہے۔یہاں کسی فریق کا بھی کوئی مستقل کردار نہیں ہے۔یہ تو میرے جیسے بادشاہ گر لوگ بتاتے ہیں کہ کون کیا کریگا۔کون سا گھوڑا تیز دوڑے گا۔پھر آہستہ ہو جائیگا اور آخر میں ہمارے حکم پر بیٹھ جائیگا۔اور نتیجہ یہ کہ ریس میں سب سے آہستہ دوڑنے والا گھوڑا بڑے آرام سے پہلے نمبر پر آ جائیگا۔

صاحب نے دوسری بار کافی منگوائی۔میرا سوال تھا، کہ حکومت تو الیکشن کے ذریعے آتی ہے اور پھر اس پر شب خون مارا جاتا ہے۔صاحب کا جواب تھا۔الیکشن،کون سا الیکشن۔سوچو،اس میں پیسہ کون لگاتا ہے۔کون مختلف پارٹیوں کو سرمایہ فراہم کرتا ہے۔کون، پھر انکے قائدین کو رات کے اندھیرے میں ملکر بتاتا ہے کہ اس کثیر رقم کو کیسے استعمال کرنا ہے۔آج تک ہمارے ملک میں جو بھی الیکشن ہوا ہے،اسکی در پردہ داستان بالکل مختلف ہے۔کس کو جتانا ہے،کس پارٹی کو ہرانا ہے۔کس شخص کو سیاسی دیوتا بنا کر پیش کرنا ہے اور کس کو شیطان۔یہ سب کچھ ہمارے جیسے لوگ کرتے ہیں۔عوام کا تو کسی الیکشن میں کوئی فیصلہ کن کردار نہیں ہوتا۔ہاں ایک اور بات۔میرے جیسے چند لوگ ہی فیصلہ کرتے ہیں کہ کس حکومت کو کب اور کیونکر ختم کرنا ہے۔ملک کی ہر حکومت پر نئے طریقے سے وار کیا جاتا ہے ایسا حربہ، جو انکے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا۔صاحب کی یہ بات بہت زیادہ سنجیدہ تھی۔اطمینان سے دوبارہ بولنا شروع کیا۔تمہارے قومی قائدین اس کمرے میں آ کر ہاتھ جوڑ جوڑ کر التجا کرتے ہیں کہ مجھے اس بار فلاں "بڑا عہدہ" دلوا دو۔کوئی وزارت کی بھیک مانگتا ہے اور کوئی بے پناہ پیسے والے ٹھیکوں کی۔ہاں،ایک اور بات۔ہر قائد یہ ضرور کہتا ہے کہ مہربانی کر کے کسی کو بھی بتائیگا نہیں کہ میں یہاں آیا تھا۔بس آپ صرف ہاں کر دیں۔میرا کام ہو جائیگا۔آپ اپنا جو مرضی حصہ رکھ لیں۔پر مجھ پر عنایت ضرور کریں۔ہاں ایک اور بات،تمہارے مذہبی قائدین بھی یہاں قدم ونجاں فرماتے ہیں۔وہ سب سے زیادہ سچ بولتے ہیں۔وہ صرف اور صرف،سیدھے طریقے سے پیسے مانگتے ہیں۔اختیار مانگتے ہیں۔تحفظ مانگتے ہیں۔پیسوں کے معاملے میں انکا کسی بھی فرقہ اور گروہ بندی پر کوئی یقین نہیں۔میرے گھر آ کر یہ سب ایک جیسے ہو جاتے ہیں۔مجھے اس بات پر یقین نہ آیا۔صاحب نے بے یقینی میرے چہرے پر پڑھ لی۔کہا،کیا تمہارا ایک جید مذہبی

لیڈر ایک بین الاقوامی ائیر پورٹ پر غیر ملکی کرنسی جبہ میں چھپا کر پاکستان لاتے ہوئے پکڑا نہیں گیا تھا۔میری لاعلمی پر صاحب نے قہر آلود قہقہ لگایا۔جید عالم کا نام لیکر کہا، کہ اسے چھڑوایا کس نے تھا۔جیل سے کیسے بچا۔میرے پاس اس سوال کا کوئی معقول جواب نہیں تھا۔صاحب کہنے لگے، ائیر پورٹ سے اس نے مجھے فون کیا تھا۔کہنے لگا۔اتنے پیسے پکڑے گئے ہیں۔آدھے آپ لے لیں۔میری جان بخشی کروادیں۔میرے ایک فون پر وہ معزز مذہبی سیاسی رہنما بڑے آرام سے آزاد ہوکر پاکستان پہنچ گیا تھا۔مگر اس نے ایک ادنیٰ حرکت کی۔واپس آکر میرا معاوضہ ادا نہیں کیا۔میں نے کچھ بھی نہیں کیا۔اس دن سے آج تک، وہ اپنی حکومت نہیں بنا پایا۔روز معافی مانگتا ہے۔پر اس کھیل کی بنیاد ہی اعتماد ہے۔ایک بار جو اس بنیاد کو چھیڑے، وہ کبھی بھی طاقتور سطح پر زندہ نہیں رہ سکتا۔

صاحب بڑے آرام سے اُٹھا۔کہنے لگا، میرا چڑیا گھر ضرور دیکھو۔دونوں گھر سے باہر آگئے۔ایکڑوں میں پھیلے ہوئے ذاتی چڑیا گھر میں ہر طرح کے جانور قید تھے۔ببر شیر، چیتے، بندر، ریچھ، مگرمچھ، زیبرے، بڑی بڑی چھپکلیاں اور سینکڑوں پرندے۔صاحب مہیب چھپکلیوں کے پنجرے کے باہر کھڑے ہوگئے۔کئی کئی فٹ لمبی یہ خوفناک چھپکلیاں پہلے صرف ٹی وی پر دیکھی تھیں۔سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ پاکستان میں کسی نے اپنے فارم ہاؤس میں پالیں ہونگی۔صاحب نے انکو بڑے پیار سے دیکھا۔پنجرے کے نزدیک کھڑا ہوکر نوکر کو کہا، کہ انکو گوشت ڈالو۔میرے سامنے نوکر نے تقریباً بیس سے تیس کلو گوشت ڈالا۔منٹوں سیکنڈوں میں گوشت چٹ کر گئیں۔انکی قیمت تقریباً تیس کروڑ ہے۔ان پر مہینے میں بارہ لاکھ خرچ ہوتا ہے۔میرا سوال تھا، کہ ان کریہہ انگیز جانوروں کی افادیت کیا ہے۔کیا ضرورت ہے انکو پالنے کی۔صاحب نے پیار سے ان چھپکلیوں کو دیکھ کر کہا، جب بھی کوئی جانور ہمارے کام کا نہیں رہتا، تو کھانے کے طور پر انکو ڈال دیا جاتا ہے۔اگر بڑا جسہ ہو، تو مگرمچھ والے تالاب میں انکی بھوک مٹانے کے کام آتا ہے۔صاحب کہنے لگے، ہم تمہارے سیاسی نظام میں بھی یہی کرتے ہیں۔جب کوئی لیڈر رہنما ہمارے لیے بوجھ بن جائے تو اسکو بھی سیاسی مگرمچھوں اور مہیب انسانی چھپکلیوں کے حوالے کر دیا جاتا ہے۔اسکا نام ونشان تک ختم ہوجاتا ہے۔ہاں، چڑیا گھر میں بہت سے بندر بھی ہیں۔جب بھی دل تماشہ دیکھنے کا چاہتا ہے تو ان مہذب نظر آنے والے بندروں کو ڈنڈے دے دیتا ہوں۔انکا کھانا روک دیا جاتا ہے۔تھوڑے سے عرصے کے بعد، بندر دیوانوں کی طرح ایک دوسرے کو ڈنڈے مار مار کر فنا کر دیتے ہیں۔یہ شغل ہمیشہ کرتا رہتا ہوں۔صاحب کہنے لگے، یہی ہم لوگ سیاسی میدان میں کرتے ہیں۔یہ ہمارا فیصلہ ہے کہ کس بندر کو کس وقت کون سا ڈنڈا مہیا کرنا ہے۔باقی سب کام خود بخود ہوجاتا ہے۔اب تم جاؤ، میرے اور مہمان آنے والے ہیں!

راؤ منظر حیات